استفتا اور فتوے کے باہمی تعلق کی معنویت:
فتاویٰ مفتی محمود کے عائلی مسائل کا نموذجی مطالعہ

سعید الرحمن٭

انسان میں اپنی ذات اور اپنے گردوپیش کے بارے میں جاننے اور درپیش مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی جستجو شروع دن سے موجود ہے، اور اسی وجہ سے انسان کے لیے حصول علم کا جذبہ فطری قرار پاتا ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے طلب علم کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا،[۱] اور حصول علم میں سوال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ اس سے انسان کو نئی معلومات تک رسائی کا موقع ملتا ہے، اور پھر ایسا سوال جس کے جواب سے انسان کو اپنی سماجی زندگی میں بہتری لانے کا موقع ملے اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم اہل ایمان کو سوال کے بارے میں انگیخت کرتا ہے۔M * + , - . / 0 L[۲] نیز حدیث نبوی میں "إنما شفاء العيّ السؤال (بے شک لاعلمی کا علاج پوچھنے میں ہے۔)"[۳] کہہ کر سوال کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے، سوال کی ایک مخصوص صورت "استفتا" کے نام سے جانی جاتی ہے، جس کا استعمال درپیش مسئلے میں شرعی رہ نمائی کے حصول کے حوالے سے ہوتا ہے اور اس طرح کے سوال کے جواب میں اسلامی شریعت کی مطلوبہ قابلیت رکھنے والے فرد یا ادارے کی جانب سے جو رہ نمائی دی جاتی ہے وہ "فتویٰ" کہلاتی ہے۔ فتویٰ اور استفتا کا باہمی تعلق بہت واضح ہے اور ان دونوں کے مطالعے ہی سے درست خطوط پر اسلامی شریعت سے استفادہ ہوتا ہے۔

٭ چیئرمین / پروفیسر، علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان۔
(chairmanislamicstudies@bzu.edu.pk)

۱- محمد بن یزید ابن ماجہ، **سنن ابن ماجه**، أبواب العلم، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، (دار إحياء الكتب العربية)،۱: ۸۱،رقم ۲۲۴۔

۲- القرآن ۱۶: ۴۳۔

۳- ابو داوٗد سلیمان بن اشعث السجستانی، **سنن أبي داؤد**، كتاب الطهارة، باب المجرور يتيمم (دارالرسالة العالمية، ۲۰۰۹ء)، رقم ۳۳۶۔

مفتی، فتویٰ دیتے وقت سائل کے سوال یعنی استفتا کو پیش نظر رکھتا ہے، استفتا کی نوعیت بسا اوقات نہایت سادہ ہوتی ہے کہ سائل یا مستفتی، محض کسی معاملے کی شرعی حیثیت دریافت کرتا ہے، گویا اس کا تعلق محض شرعی علم کا حصول ہوتا ہے، مثلاً جیسے یہ سوال کہ طلاق کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس طرح کے سوال کے جواب میں مفتی طلاق کی شرعی حیثیت کو مختلف صورتوں کے حوالے سے بیان کر کے سائل یا مستفتی کے علم میں اضافہ کرے گا؛ گویا مفتی کے سامنے ان صورتوں کے عملی اطلاق کی نوعیت نہیں ہوگی اور اب یہ مستفتی پر منحصر ہے کہ وہ درپیش صورت حال میں اس جواب سے کس طرح استفادہ کرتا ہے۔ اس طرح کے جواب میں مفتی مکمل طور پر اپنی دینی معلومات پر انحصار کرتا ہے اور ان معلومات کی وسعت اور نوعیت کے مطابق وہ جواب مہیا کرتا ہے، لیکن بسا اوقات استفتا میں درپیش صورت حال کا تذکرہ کر کے مفتی سے اس حوالے سے رہ نمائی مطلوب ہوتی ہے، اس صورت میں مفتی پر دو بنیادی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں: پہلی تو یہ ہے کہ وہ استفتا میں بیان کردہ صورت حال کا تجزیہ کرے؛ یہ فقہ الحادثة کہلاتا ہے اور پھر اس کی روشنی میں شریعت کی رہ نمائی سے آگاہ کرے، اس کو فقہ الحکم الشرعي کہا جاتا ہے اور یہ دونوں امور بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

اگر مفتی، استفتا میں بیان کردہ صورت مسئلہ کو نظر انداز کر دیتا ہے یا اس کے حوالے سے درست تجزیہ نہیں کرتا تو اس صورت میں اس کے فتوے پر "متعلقہ" ہونے کے سوالات اٹھ سکتے ہیں، کیوں کہ محض کسی شرعی حکم کی نشان دہی مفتی کے فرائض منصبی میں شامل نہیں، بلکہ مستفتی کا بیان اور اس کے گرد و پیش واقفیت اس کے لیے ازبس ضروری ہے، اسی بنا پر کہا گیا ہے: "من جهل بأهل زمانه فهو جاهل."[۴] گویا مفتی کے لیے اپنے دور کے لوگوں کے رجحانات فکر و عمل سے واقفیت کا ہونا ضروری ہے اور اسی بنا پر معروف فتویٰ نگار فقیہ علامہ ابن عابدین الشامی (م ۱۸۳۶ء) کہتے ہیں کہ مفتی یا قاضی کا منقول روایات کے ظاہر پر جمود اختیار کرنا اور واضح قرائن اور لوگوں کے حالات سے ناواقف رہنا بہت سے حقوق ضائع کرنے اور لوگوں کی اکثریت پر ظلم کے مترادف ہے۔[۵]

۴- محمد امین ابن عابدین الشامی، **شرح عقود رسم المفتي**، ترجمہ: سعید احمد پالن پوری (کراچی: مکتبہ البخاری، (س۔ن))، ۱۱۹۔

۵- نفسِ مصدر، ۱۲۰۔

جب کوئی مستفتی، استفتا پیش کرتا ہے تو اس میں ذکر کردہ بیانات کی توثیق و تصدیق مفتی کے ذمے نہیں ہوتی اور اس کو بیانات ہی پر انحصار کرنا ہوتا ہے، لیکن مفتی کو اس امر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ ان بیانات کا پس منظر کیا ہے، اور معاشرے کے عرف و عادات کیا ہیں تاکہ وہ مستفتی کو درست خطوط پر رہ نمائی دے سکے۔ علامہ ابن قیم الجوزیہ (۷۵۱ھ) کہتے ہیں: "ينبغي له أن يكون فقيها في معرفة مكرالناس و خداعهم و احتيالهم و عوائدهم وعرفياتهم، فإن الفتوى تتغير بتغير الزمان والمكان والعوائد والأحوال، وذلك كله من دين الله."[۶] (مفتی کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ لوگوں کے مکر و فریب، ان کے حیلے بہانے اور ان کی عادات و رواجات کو جاننے میں گہرا فہم رکھنے والا ہو کہ فتویٰ، زمان و مکان اور عادات و حالات کے بدلنے سے بدل جاتا ہے اور یہ تمام امور، اللہ کے دین کا حصہ ہیں۔)

لہٰذا فتوے کے لیے یہ امر ناگزیر قرار پاتا ہے کہ مفتی کو استفتا میں مذکور معاملات کا گہرا ادراک حاصل ہو، کیوں کہ اس کے بغیر اس کا جواب کتابی مطالعے کے مطابق تو ہو سکتا ہے مگر وہ فتوے کے تقاضوں پر پورا نہیں اترے گا، چناں چہ ابن قیم وضاحت کرتے ہیں: "فالواجب شيء، والواقع شيء، والفقيه من يطبق بين الواقع والواجب، و ينفذ الواجب بحسب استطاعته، لا من يلقي العداوة بين الواقع والواجب، فلكل زمان حكم، والناس بزمانهم أشبه بآباءهم."[۷] (شرعی طور پر) واجب حکم ایک امر ہے اور واقعہ (درپیش صورت حال) بھی ایک امر ہے۔ فقہ کا ماہر وہی ہوتا ہے جو درپیش صورت حال اور (شرعی) واجب حکم کے درمیان ہم آہنگی قائم کرتا ہے اور واجب حکم کو حتی الامکان نافذ کرتا ہے، ایسا شخص نہیں ہوتا جو درپیش صورت حال اور واجب حکم کے درمیان عداوت و بعد پیدا کر دے کہ ہر زمانے کا ایک حکم ہوتا ہے اور لوگ اپنے زمانے کے لحاظ سے اپنے آباؤ اجداد کے ہی زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔)

برصغیر پاک و ہند میں بالعموم فتوے کے لیے نجی مذہبی تعلیمی اداروں میں قائم دارالافتا کے فتوے کو اہمیت دی جاتی ہے، اس ضمن میں ان کی علمی خدمات لائق تحسین اور ان کی شخصیات قابل احترام ہیں اور ان تعلیمی

۶۔ محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ، **إعلام الموقعين عن رب العالمين** (بیروت: دار إحياء التراث العربي، ۲۰۰۱ء)، ۴: ۱۷۳۔

۷۔ نفس مصدر، ۱۸۶۔

اداروں یا مدارس یا ان میں کام کرنے والے مفتی حضرات کی ساکھ کی بنیاد پر ان کے فتاویٰ کو پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔ آج بھی عائلی معاملات بالخصوص نکاح و طلاق کے مسائل کے حوالے سے بالعموم مفتی حضرات کی طرف رجوع اور ان پر اعتماد کیا جاتا ہے، جس کے سبب اس کے مقابلے میں سرکاری قانون بھی بسااوقات اپنی مطلوبہ اہمیت حاصل نہیں کر پاتا۔ اس تناظر میں ان حضرات پر بھاری ذمے داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مستفتی خواتین وحضرات کی متوازن رہ نمائی سے عہدہ برآ ہوں؛ کیوں کہ مفتی اور غیر مفتی عالم کے مابین ایک واضح فرق یہ ہے کہ غیر مفتی عالم کی رائے اپنے علم کی بنیاد پر ہوتی ہے اور اس کا اس امر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ اس کی رائے کو کتنی وقعت حاصل ہو گی، چناں چہ اس کی رائے سے اختلاف یا اتفاق ایک علمی موضوع ہوتا ہے، جب کہ مفتی کی رائے کے بارے میں تاثر یہ ہے کہ وہ مستفتی پر اثرانداز ہوتی ہے کہ وہ مفتی پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے متعلقہ امور طے کرتا ہے اور اپنے حدود کار کا تعین کرتا ہے، حتیٰ کہ بسا اوقات اس سلسلے میں رائج قانون اور عدالتی فیصلہ کے مقابلے میں فتوے کو اساسی حیثیت دے کر اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔

برصغیر کے مطبوعہ فتاویٰ میں دو انداز کے فتوے پائے جاتے ہیں: ایک تو وہ فتاویٰ ہیں جن میں مفتی نے اپنی دانست کے مطابق محض رائے دینے پر اکتفا کیا اور اس سلسلے میں کسی دلیل یا حوالے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اس کی وجہ واضح ہے کہ عام طور پر مستفتی کو شرعی حکم سے غرض ہوتی ہے اور وہ مفتی کے فہم پر اعتماد کرتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ بعض استفتارات (شرعی سوال) کے جواب میں مفتی نے مفصل گفت گو کی ہے اور اس کے فتوے میں بالعموم گذشتہ دور کے معروف مجموعہ ہائے فتاویٰ کے حوالہ جات موجود ہوتے ہیں، جن سے وہ اپنے نقطۂ نظر کی تائید حاصل کرتا ہے۔

برصغیر پاک وہند میں جو فتاویٰ کے مجموعے منظرعام پر آئے ہیں ان میں سے اکثر یا تو کسی معروف مذہبی شخصیت سے نسبت رکھتے ہیں جیسے **فتاویٰ رشیدیہ**، مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۹۰۵ء) کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، یا کسی دینی تعلیمی ادارے کا عنوان رکھتے ہیں، جیسے **فتاویٰ دارالعلوم دیوبند** یا ان کی نسبت کسی مسلک کی طرف ہے جیسے **فتاویٰ اہل حدیث** وغیرہ، اور اس طرح کے فتاویٰ کو ان شخصیات یا اداروں یا مسالک سے عقیدت رکھنے والے حلقوں میں پذیرائی حاصل ہے، لہٰذا ان حلقوں میں دریافت کیے جانے والے سوالات کے جوابات میں بسا اوقات ان فتاویٰ پر انحصار کرتے ہوئے ان کے جوابات کو من وعن نقل کر دیا جاتا ہے اور شرعی دلائل بلکہ ماضی کے ذخیرہ فتاویٰ کی طرف مراجعت یا ان کے تجزیے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی، لہٰذا برصغیر کے مطبوعہ فتاویٰ کے مواد

(استفتا و جواب استفتا) کی علمی تجزیے کی ضرورت ہے تاکہ ان سے استفادے اور استدراک کی صورت واضح ہو سکے۔

اکیسویں صدی میں پاکستان میں منظر عام پر آنے والے مجموعہ ہاے فتاویٰ میں ایک نمایاں نام **فتاویٰ مفتی محمود**[۸] کا ہے۔ مولانا مفتی محمود پاکستان کی معروف مذہبی حیثیت اور سیاسی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جنوری ۱۹۱۹ء کو پنیالہ (ڈیرہ اسماعیل خاں) میں پیدا ہوئے، آپ کے والد محترم خلیفہ محمد صدیق قندھار (افغانستان) سے نقل مکانی کر کے آئے تو خانقاہ یاسین زئی کے بزرگ مولانا سید عبدالعزیز شاہ نے آپ کو جاے سکونت فراہم کی، مفتی صاحب نے ۱۹۴۰ء میں جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد سے دینی تعلیم مکمل کی۔ بعد ازاں وہ اپنے علاقے میں تدریسی ذمے داریاں ادا کرنے لگے، یہاں تک کہ ملتان آ کر مدرسہ قاسم العلوم سے بہ طور مدرس (بعد ازیں شیخ الحدیث و صدر مفتی) وابستہ ہو گئے۔ انہیں ملکی سیاست میں نمایاں مقام حاصل رہا، وہ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے منتخب رکن تھے جس نے ۱۹۷۳ء کا متفقہ دستور منظور کیا تھا۔ وہ صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) کے وزیر اعلیٰ اور قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف بھی رہے۔ آپ رابطہ عالم اسلامی کے رکن بھی رہے، ۱۹۷۹ء میں کراچی میں وفات پائی۔[۹]

مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۵۰ سے ۱۹۷۵ء تک کے عرصے کے دوران میں تقریباً بائیس ہزار فتاویٰ جاری کیے۔ اس سلسلے میں ان کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمن وضاحت کرتے ہیں کہ "ان فتاویٰ جات میں بہت سے فتاویٰ پر حضرت والد صاحب کے نام کے بجائے دیگر مفتیانِ کرام کے نام درج ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت والد صاحب اپنی انتہائی مصروفیات کی بنا پر جب خود فتویٰ نویسی کی فرصت نہ پاتے تو معین مفتی[۱۰] کو سپرد فرما دیتے۔ معین مفتی، حضرت مفتی صاحب کی ہدایت کے مطابق فتویٰ تحریر کرتے اور مفتی صاحب کی زبانی یا تحریری

۸۔ یہ مجموعۂ فتاویٰ ۲۰۰۱ء میں پہلی بار زیور طباعت سے آراستہ ہوا، اس کی اب تک سات جلدیں طبع ہو چکی ہیں اور چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس کو حافظ محمد ریاض درانی نے جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور سے شائع کیا، مولانا نعیم الدین کی رہ نمائی میں مولانا عبدالرحمن اور مولانا نعیم اللہ نے اس کی ترتیب و تبویب کا کام کیا جبکہ مولانا محمد عرفان اس کی تصحیح کی ذمے داری سے عہدہ بر آ ہوئے۔ مولانا مفتی محمود، **فتاویٰ مفتی محمود** (لاہور: جمعیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ۱: ۳۵۔

۹۔ نفس مصدر، مقدمہ مولانا محمد جمیل خاں، ۱: ۲۴ و مابعد۔

۱۰۔ معین مفتی کے طور پر مولانا فضل الرحمن نے مولانا سید عبدالرحمن ابا خیل، مفتی احمد جان پنیالہ، مفتی عبداللطیف عبدالخیل اور مفتی محمد کے علاوہ مفتی محمد عبداللہ (استاذ حدیث و مفتی جامعہ خیر المدارس) کے ناموں کی نشان دہی کی ہے (مصدرِ سابق، ۱: ۴۲) جب کہ ان کے علاوہ اس مجموعۂ فتاویٰ میں مفتی محمد انور شاہ اور مفتی محمد اسحاق کا بھی ذکر موجود ہے۔

تصدیق کے بعد اسے جاری کرتے، اس لحاظ سے یہ حضرت مفتی صاحب ہی کے فتاویٰ ہوئے۔[۱۱] گو ہماری رائے میں اس مجموعۂ فتاویٰ کا نام ''فتاویٰ قاسم العلوم ملتان'' رکھا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔

زیر نظر مضمون میں **فتاویٰ مفتی محمود** میں مذکور چار عائلی موضوعات سے متعلق حنفی نقطۂ نظر سے دیے گئے فتاویٰ کا ان کے متعلقہ استفتاءات کے پس منظر میں ایک نموذجی جائزہ پیش کرنا مقصود ہے تا کہ فتوے اور استفتا کی باہمی معنویت واضح ہوسکے۔

۱- ولایت و کفاءت:

کم سن بچے یا بچی کے نکاح کے حوالے سے جمہور فقہا، جس میں چاروں معروف فقہی مسالک کے اصحاب شامل ہیں، کا نقطۂ نظر جواز کا ہے، اور وہ صغیر کے نکاح کرنے کا اختیار اس کے ولی کو دیتے ہیں۔[۱۲] حنفی نقطۂ نظر سے کمسن کی ولایت نکاح بالترتیب باپ، دادا، بھائی اور چچا کے بعد والدہ کو حاصل ہوتی ہے، تاہم فرق یہ ہے کہ حنفی فقہا باپ، دادا کے کیے ہوئے نکاح کو ناقابل تنسیخ قرار دیتے ہیں،[۱۳] چناں چہ ان کے ہاں کم سن کو بلوغت کے بعد اس نکاح کو ختم کرنے کا اختیار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ باپ دادا نے اس اختیار کو کم سن کے مفاد کے برعکس استعمال کیا تو ایسی صورت میں بلوغت کے بعد عدالت کے ذریعے تنسیخ نکاح کا حق حاصل ہوتا ہے،[۱۴] اس حوالے سے متعلقہ استفتا اور فتویٰ ملاحظہ ہو:

۱۱- نفس مصدر۔

۱۲- فقہاے تابعین میں سے عثمان البتی (م ۱۴۳ھ) اور عبداللہ بن شبرمہ (م ۱۴۴ھ) کے علاوہ ابو بکر عبدالرحمن الاصم (م ۲۰۱ھ) کی راے میں قبل از بلوغت نکاح کا شرعی جواز نہیں ہے۔(وہبۃ الزحیلی، **الفقه الإسلامي و أدلته** (بیروت: دار الفکر (س-ن))، ۷: ۱۷۹۔

۱۳- ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانی، **الهداية** (ملتان: مکتبہ شرکۃ علمیہ (س-ن))، ۲: ۳۱۷۔

۱۴- علامہ علاء الدین حصکفی (۱۰۸۸ھ) کہتے ہیں کہ اگر باپ دادا کا اختیار غلط استعمال کرنا معروف ہو تو ان کا کیا ہوا نکاح صغار درست نہ ہو گا، ان کے الفاظ ہیں: وإن عرف لا يصح النكاح اتفاقا، و كذا لو كان سكران فزوجها من فاسق أو شرير أو فقير أو ذي حرفة دنية لظهور سوء اختياره فلا تعارضه شفقته المظنونة. (علاء الدین الحصکفی، **الدر المختار شرح تنوير الأبصار** (کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی (س-ن))، ۳: ۶۷۔

استفتا:

کیا فرماتے ہیں علماے دین دریں مسئلہ کہ ایک لڑکی کا نکاح صغر سنی میں والد نے ایسے مقام پر کر دیا جو کہ نہایت ظالم، اوباش، بدمعاش، عصمت فروش، بے عزت، بے مروت، بے غیرت و بے پردہ پھرنے پر مجبور کرنے والا ہے۔ اس شخص کی ایک اور منکوحہ بھی ہے جو کہ نہایت شریف ہے، لیکن وہ ظالم اس بے چاری کو اتنا تنگ کرتا ہے کہ مجبور ہو کر میکے چلی جاتی ہے، اپنے خاوند کے گھر آباد ہونے کا نام تک نہیں لیتی، ایسے آدمی سے صغیرہ کا نکاح ہو چکا تھا مگر اب صغیرہ جوان ہونے کے بعد جب حالات سے آگاہی ہوئی تو کہتی ہے میں ایسے ظالم کے گھر مطلق آباد نہیں ہوں گی۔ اب لڑکی کے ورثا مجبور ہیں، ان حالات میں کیا طلاق لی جا سکتی ہے، تنسیخ کرانا جرم تو نہیں، جو فیصلہ شریعت کا ہو تحریر فرمادیں۔ بینوا تؤجروا۔

فتویٰ:

ایسے بد دین آدمی سے لڑکی کو الگ کرنا چاہیے یا تو وہ طلاق دے دے اور اگر وہ طلاق نہیں دیتا تو کسی مسلمان حاکم کی عدالت کے ذریعے شرعی ضابطے کو اختیار کر کے عدالتی حکم حاصل کیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم [۱۵]

زیر نظر فتوے میں درست تناظر میں عدالتی تنسیخ کی شرعی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے اسے اختیار کرنے کی رائے دی گئی ہے، فقہ حنفی میں ایسے ولی کے اختیارات، سوے استعمال کے سبب عدالتی نظر ثانی کے دائرے میں آجاتے ہیں [۱۶] گو فتوے میں اس کی کوئی نشان دہی نہیں کی گئی اور نہ ہی اس شرعی ضابطے کی وضاحت کی گئی ہے جس کے تحت عدالتی حکم حاصل کیا جائے؛ تاہم اگر باپ، دادا کے علاوہ کسی اور رشتے دار نے کم سن بچے یا بچی کا نکاح سماجی حیثیت (کفاءت) اور خاندانی مہر (مہر مثل) کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا تو وہ نکاح فقہی طور پر صحیح تصور کیا جاتا ہے مگر ایسی صورت میں انھیں خیار بلوغ حاصل ہوتا ہے۔ اس تناظر میں ولایت نکاح اور خیار بلوغ کے بارے میں استفتا کے پس منظر میں متعلقہ فتوے کا مطالعہ پیش ہے۔

۱۵۔ مفتی محمود، **فتاویٰ مفتی محمود**، ۷: ۴۳۔

۱۶۔ الحصکفی، مصدرِ سابق، ۳: ۶۷۔

استفتا:

جناب مفتی صاحب! درج ذیل مسئلے میں شریعت اسلامی کے مطابق آپ کی رائے درکار ہے۔ ایک لڑکی کی پیدائش والد کی وفات سے تقریباً چھے ماہ بعد ہوئی۔ لڑکی ابھی نابالغ تھی کہ اس کے بڑے بھائیوں نے باہمی مشورے سے لڑکی کو شادی کی غرض سے اس نابالغ لڑکی کا نکاح صرف زبانی طور پر پڑھ دیا جس میں لڑکی کی والدہ اور سب سے بڑے بھائی کی رضامندی شامل نہ تھی۔

بعد ازاں لڑکی اپنی والدہ کے ہاں رہی اور جوان ہوئی۔ نکاح کرنے والے بھائیوں کے والدہ کے ساتھ تعلقات کشیدہ رہے اور لڑکی کے جوان ہونے پر جب اس سے ازدواجی زندگی کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے چار پانچ معتبر گواہوں کی موجودگی میں سابقہ نکاح سے لاتعلقی اور آئندہ زندگی کے بارے میں والدہ کے فیصلے کو قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی جس پر اس کی والدہ اور دو بھائیوں نے اس کے شادی کر دی اور لڑکی مذکورہ چند ماہ سے اپنے گھر آباد ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا والدہ کی رضامندی کے ساتھ کیا جانے والا یہ حالیہ نکاح اور شادی درست ہے یا نہ؟ کیا اب یہ لڑکی نابالغی کی حالت میں کیے جانے والے بھائیوں کے نکاح، جس میں اس کی والدہ کی رضامندی شامل نہ تھی، کی پابند تھی یا نہ؟ شریعت اسلامی کی روشنی میں واضح کیا جائے کہ نابالغ ہونے کی صورت میں کیا جانے والا زبردستی کا نکاح واقع اور منعقد ہوا تھا یا نہیں؟ فتویٰ دیا جائے۔

فتویٰ:

اگر نابالغہ لڑکی کا باپ دادا زندہ موجود نہ تھا تو تمام بالغ بھائیوں کو ولایت حاصل تھی، والدہ کو ولایت نہیں، لہٰذا تحقیق کی جائے۔ اگر بعض بالغ بھائیوں نے لڑکی کی نابالغی میں شرعی طریقے سے ایجاب و قبول کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں نابالغہ بہن کا نکاح کر دیا ہے تو وہ نکاح صحیح اور نافذ ہے اور خاوند سے طلاق حاصل کیے بغیر دوسری جگہ جو نکاح کیا ہے وہ منعقد نہیں ہوا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم [۱۷]

زیر نظر استفتا میں کم سن بچی کے اولیا کے طور پر بھائیوں اور والدہ کا ذکر کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ اس کے نکاح کے حوالے سے بچی کی والدہ اور سب سے بڑا بھائی متفق نہ تھے جب کہ دیگر بھائیوں نے صغر سنی میں نکاح کر دیا، بعد ازیں بچی نے بالغ ہونے پر اس نکاح سے لاتعلقی ظاہر کر دی اور آئندہ کے لیے اپنی والدہ کو نکاح کا اختیار

۱۷- مفتی محمود، مصدرِ سابق، ۴: ۶۵۵۔

دے دیا، گویا فقہ کی زبان میں وکالت سونپ دی۔ اس صورت حال میں فتوے میں حنفی نقطۂ نظر سے یہ بات تو درست ہے کہ باپ دادا کی عدم موجودگی میں نابالغ کی ولایت نکاح بھائیوں کو حاصل ہے، والدہ کو نہیں، لیکن اس بات کو زیر بحث نہیں لایا گیا کہ اگر بھائیوں میں اختلاف رائے ہو تو ایسی صورت میں آیا بڑے بھائی کو اس میں ترجیح حاصل ہے۔ جیسا کہ زیر نظر صورت میں بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائیوں کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا یا کچھ بھائیوں کے حق ولایت استعمال کرنے سے دوسروں کا حق قائم رہتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں حنفی فقہا کے دو نقطہ ہائے نظر ہیں کہ اگر کسی جگہ ایک سطح کے کئی اولیا ہوں جیسے حقیقی بھائی ہوتے ہیں اور ان میں سے کچھ نکاح پر رضامند ہوں اور کچھ نہ ہوں تو ایسی صورت میں امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) اور امام محمد بن حسن الشیبانی (م ۱۸۹ھ) کی رائے میں دوسروں کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔ غالباً فتوے میں اس رائے کو بنیاد بنایا گیا ہے جب کہ امام ابو یوسف (م ۱۸۲ھ) سمیت دیگر فقہا کے ہاں دوسرے اولیا کا حق اعتراض قائم رہتا ہے۔[۱۸] اور دوسری بات یہ ہے کہ حنفی فقہ کی رو سے باپ دادا کے علاوہ دیگر اولیا کو ولایت نکاح صغیر حاصل تو ہے، لیکن اگر وہ کفو سے ہٹ کر یا نہایت کم مہر پر نکاح کرتے ہیں تو وہ نکاح درست تصور نہیں ہو گا، لیکن اگر وہ کفاءت اور مہر مثل کا خیال رکھ کر کم سن کا نکاح کرتے ہیں تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے، مگر ایسی صورت میں کم سن کو خیار بلوغ بہ روے کار لانے کا عدالتی حق حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ علامہ علاء الدین حصکفی (م ۱۰۸۸ھ) قرار دیتے ہیں:

"إن كان المزوج غير الأب وأبيه لا يصح النكاح من غير كفؤ أو بغبن فاحش أصلا، وإن كان من كفؤ و بمهر المثل صح، ولكن لهما أي للصغير والصغيرة خيار الفسخ ولو بعد الدخول بالبلوغ أو العلم بالنكاح بعده بشرط القضاء للفسخ." (ملخص)[۱۹]

زیر نظر صورت میں ایسا ہی ہے، چناں چہ بچی نے بالغ ہونے کے بعد جب گذشتہ نکاح سے لاتعلقی ظاہر کر دی ہے اور اس کی رضامندی سے دوسرا نکاح کر دیا گیا تو فتوے میں استفتا میں بیان کردہ صورت حال کے برعکس یہ قرار دیا گیا کہ گذشتہ نکاح صحیح اور نافذ ہے اور خاوند سے طلاق حاصل کیے بغیر دوسری جگہ کیا گیا نکاح منعقد نہیں ہوا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ استفتا کو مکمل تفصیلات کے ساتھ پیش نظر نہیں رکھا گیا۔

۱۸- الزحیلی، **الفقه الإسلامي و أدلته**، ۷: ۲۳۸۔

۱۹- الحصکفی، **الدر المختار**، ۳: ۶۷- ۶۹۔

۲-مہر کے مسائل

اسلامی شریعت نے عقد نکاح کی اہمیت کو اجاگر کرنے اور بالخصوص اس عقد میں منسلک ہونے والی عورت کی عزت افزائی اور اس کی معاشی خود انحصاری کی علامت کے طور پر مرد کو پابند کیا ہے کہ وہ اس حوالے سے اپنی بیوی کو اس کی سماجی حیثیت کے مطابق اعزازیہ دے جو فقہ کی اصطلاح میں "مہر" کہلاتا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:L v u t s M[۲۰] چناں چہ عورت عقد نکاح کے سبب مہر کی قانونی حق دار قرار پاتی ہے۔ ذیل میں مہر سے متعلق دو فتاویٰ کا متعلقہ استفتا کے تناظر میں ایک جائزہ پیش ہے۔

(الف) استفتا:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ زید نے اپنی بالغہ لڑکی کا نکاح عمر کے بھائی سے کر دیا اور اس کے عوض میں عمر نے اپنی لڑکی کا نکاح زید کے بیٹے سے کر دیا جو اس وقت نابالغہ تھی۔ نکاح کے وقت مہر کی رقم پچیس روپے حق مہر درج ہوئی، مگر کچھ عرصہ بعد عمر نے زید کے بیٹے سے ایک اقرار نامہ لکھوالیا کہ چار بیگھے اراضی اور کچھ زیورات بہ طور حق مہر دینا ہوگا حالاں کہ نکاح اور اندراج کے وقت پچیس روپے تھے۔

نیز واضح رہے کہ عمر نے جس لڑکے سے زمین وغیرہ لکھوائی ہے اس لڑکے کے نام کوئی زمین وغیرہ نہیں ہے البتہ اس کے باپ کے دست خط ثبت ہیں مگر جس کنویں کا رقبہ لکھا گیا ہے اس میں بھی اس کا رقبہ نہیں تو شرعاً کون سا حق مہر دینا ہوگا؛ پچیس روپے یا زمین و زیورات؟

فتویٰ:

اگر یہ بات صحیح ہے کہ جس کنویں کا رقبہ لکھ دیا گیا ہے، اس کنویں پر شخص مذکور کے باپ کا رقبہ نہیں ہے تو یہ عورت صرف پچیس روپے تحریر شدہ مہر لینے کی حق دار ہے۔ زائد جو بعد میں لڑکے سے لکھوایا گیا ہے وہ حاصل کرنے کی حق دار نہ ہوگی۔ فقط واللہ اعلم[۲۱]

استفتا میں مذکور صورت کے مطابق عقد نکاح کے وقت مہر پچیس روپے مقرر ہوا، بعد ازیں باہمی رضامندی سے چار بیگھے اراضی اور کچھ زیورات مقرر کیے گئے، مذکورہ استفتا میں جو امور بحث طلب ہیں، ان میں سے

۲۰- القرآن ۴: ۴۔

۲۱- مفتی محمود، فتاویٰ،۵: ۳۴۵-۳۴۶ (فتویٰ مفتی محمد اسحاق)۔

ایک یہ کہ حنفی فقہ کے مطابق پچیس روپے کی بہ طور مہر کیا حیثیت ہے؟ دوم یہ کہ بعد میں مقرر کردہ مہر کی کیا نوعیت ہے؟ سوم یہ کہ جو زمین کاغذات میں لکھی گئی وہ شوہر یا دست خط کنندہ باپ کی ملکیت نہیں اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ دیے گئے فتوے میں ان امور پر کماحقہ توجہ نہیں دی گئی، چناں چہ پچیس روپے بہ طور مہر لازم ہونے کا فتویٰ دیا گیا ہے، حالاں کہ فقہ حنفی کی رو سے کم از کم مہر دس درہم یعنی دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے،[۲۲] جس کا اندازہ ۱۳۹۴ھ میں بیالیس روپے کیا گیا تھا،[۲۳] جب کہ زیر نظر فتویٰ ۱۳۹۸ھ میں جاری کیا گیا جس سے یہ امر تو یقینی ہو جاتا ہے کہ پچیس روپے، دس درہم سے کم تر ہے، ایسی صورت میں یہ رقم مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ایسی صورت میں مہر مثل لازم ہوتا ہے۔ جہاں تک بعد میں مقرر کیے جانے والے مہر کا تعلق ہے تو اس کو فقہ حنفی میں معتبر خیال کیا جاتا ہے جیسا کہ **الهداية** میں اس کی نشان دہی کی گئی ہے۔"فإن زادها في المهر بعد العقد، لزمته الزيادة۔"[۲۴]

استفتا میں مذکور صورت کے مطابق بعد میں مقرر کردہ مہر میں ایک حصہ (زیورات) شوہر کی ملکیت ہے اور دوسرا حصہ (زمین) غیر مملوکہ ہے، اس حوالے سے فقہ حنفی میں تین مؤقف پائے جاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی رائے میں صرف مملوکہ حصہ ہی مہر بنے گا بہ شرطے کہ دس درہم سے کم نہ ہو؛ امام ابویوسف کی نظر میں مملوکہ چیز کے علاوہ غیر مملوکہ چیز کی قیمت بہ طور مہر شوہر کے ذمے ہے جب کہ امام محمد بن حسن کے نزدیک مملوکہ حصہ کے علاوہ اتنی زائد رقم دینا ہوگی کہ مجموعی طور پر مہر مثل کے مساوی ہو جائے۔[۲۵] اس اختلاف رائے کی صورت میں مفتی کو لائق ترجیح قول کی نشان دہی کرنی چاہیے تھی تاکہ مستفتی کو واضح رہ نمائی مل سکے۔

(ب) استفتا:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ ایک آدمی کا نکاح ہوا۔ عورت کے عقد میں حق مہر میں پانچ تولہ سونا رکھا گیا۔ بہ وقت نکاح آدمی نے اڑھائی تولہ سونا ادا کر دیا اور پھر عورت نے دو تولہ سونا معاف کر دیا، پھر کچھ

۲۲- نفس مصدر، ۵: ۳۱۰؛ (فتویٰ مفتی محمد انور شاہ)۔

۲۳- نفس مصدر، (فتویٰ مفتی محمد عبداللہ)۔

۲۴- ابو الحسن برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی: **الهداية في شرح بداية المبتدي**، تحقیق: طلال یوسف (بیروت: دارإحياء التراث العربي)، ۱: ۲۰۰۔

۲۵- نفس مصدر، ۱: ۲۰۲۔

عرصے بعد مرد نے طلاق دے دی اور آدھ تولہ سونا بھی ادا کر دیا، لیکن عورت کہتی ہے کہ میں نے وہاں معاف کیا تھا۔ یہاں معاف نہیں کرتی۔ لہٰذا حق مہر پورا کیا جائے تو کیا آدمی کو پورا کر دینا چاہیے یا بری ہے؟

فتویٰ:

اگر یہ درست ہے کہ مذکورہ عورت نے مہر کا دو تولہ سونا اپنے خاوند کو معاف کر دیا تو وہ معاف ہو گیا ہے۔ اب اس کا یہ کہنا درست نہیں کہ میں یہاں معاف نہیں کرتی۔ فقط واللہ اعلم [۲۶]

استفتا کے مطابق بیوی نے مہر کے طور پر مقرر پانچ تولہ سونے میں سے دو تولہ معاف کر دیا تھا، مگر طلاق کے بعد اس نے اس معافی کی وضاحت کی کہ اس نے وہاں معاف کیا تھا، یہاں نہیں، جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ عقد نکاح کے باقی رہنے کی صورت میں مہر کا ایک حصہ معاف کیا گیا تھا، جب کہ طلاق کے بعد صورت حال تبدیل ہو گئی۔ بیوی کی مذکورہ وضاحت قرین قیاس ہے اور خلاف عرف بھی نہیں کہ عمومی انسانی مزاج وماحول سے بھی مطابقت رکھتی ہے، کہ شریک حیات ہونے کے ناطے اس نے حسن سلوک اور مروت کا اظہار کیا ہے اور جب شوہر نے قطع تعلق کر لیا تو اب وہ اس مروت اور رواداری کا حق دار نہیں رہا۔ لہٰذا بیوی کی طرف سے مہر کی معافی میں طیب خاطر کا نہ ہونا واضح ہو چکا ہے، اور طیب خاطر کے بغیر شوہر کے لیے بیوی کا مہر اپنے پاس رکھنا کسی طور درست نہیں، ارشاد خداوندی ہے: M فَإِن طِبۡنَ لَكُمۡ عَن شَيۡءٖ مِّنۡهُ نَفۡسٗا فَكُلُوهُ هَنِيٓـٔٗا مَّرِيٓـٔٗا L [۲۷] جب کہ فتوے میں ظاہری الفاظ کی اساس پر بیوی کی وضاحت کو قبول نہیں کیا گیا حالاں کہ متکلم اپنی بات کی وضاحت کا نہ صرف مجاز ہوتا ہے بلکہ قرینے کی بنیاد پر اس کی منشا کو اس کے الفاظ کے ظاہر پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ [۲۸]

علامہ ابن الہمام (۸۶۱ھ) کہتے ہیں کہ تحقیقی بات یہ ہے کہ پیش آمدہ واقعات کے حوالے سے مفتی میں ایک درجہ اجتہاد کی صلاحیت اور لوگوں کے احوال سے واقفیت ضروری ہے۔ [۲۹] اس بات کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا کہ صاحب فتاویٰ کے اجتہاد میں بیوی کی بات بے وزن ہو، لیکن یہ امر محتاج برہان ہے۔

۲۶- مفتی محمود، فتاویٰ، ۵: ۳۲۶؛ (فتویٰ مفتی محمد اسحاق)۔

۲۷- القرآن ۴:۴۔

۲۸- عبدالکریم زیدان، **الوجيز في أصول الفقه** (لاہور: اسلامی اکادمی، (س۔ن))، ۳۳۴۔

۲۹- محمد بن عبدالواحد کمال الدین ابن الہمام، **شرح فتح القدير** (دار الفکر، س۔ن)، ۲: ۲۵۹۔

۳- نکاح شغار

پاکستان کے دیہاتی کلچر میں طے کردہ ادلہ بدلہ کی شادیوں کا رواج پایا جاتا ہے اس کو شریعت کی اصطلاح میں "شغار" کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک عورت سے نکاح کو دوسری عورت سے نکاح کا معاوضہ تصور کیا جاتا ہے اور علاحدہ علاحدہ مہر مقرر نہیں ہوتا، اس کو مقامی عرف میں "وٹہ سٹہ" کا نکاح بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں نکاح کے کم زور فریق کے طور پر عورت کی رائے کو عام طور پر درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا ہے؛ اس حوالے سے ایک فتویٰ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

استفتا:

کیا فرماتے ہیں علماے دین دریں مسئلہ کہ ایک خاندان کے افراد کے درمیان رشتہ ناتا ہوتا ہے، دونوں طرف سے لینے دینے کا وعدہ بلکہ نکاح ہو جاتا ہے۔ اب ایک لڑکی منکوحہ دار فانی سے چل بسی اور ایک لڑکی منکوحہ زندہ باقی ہے۔ اب جو لڑکی زندہ ہے اس کے ولی دینے کے لیے تیار نہیں، ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم اپنی لڑکی تب دیں گے جب آپ اس کا بدل دیں، دوسری وجہ نہ دینے کی یہ ہے کہ لڑکا چرس پیتا ہے اور بے روزگار ہے اور زانی فاحش قسم کا آدمی ہے۔ اب جو لڑکی زندہ منکوحہ ہے اس کے والدین ایسے اوباش قسم کے آدمی کو اپنی لڑکی دینا گوارہ نہیں کرتے۔ جب نکاح ہوا تھا تقریباً اس کو اٹھارہ سال ہو گئے ہیں اور سابقہ عمر یعنی نکاح کے وقت بھی اٹھارہ سال عمر تھی تو تقریباً ۳۵، ۳۶ سال ہونے والے ہیں۔ اب ہم شرع شریف کی رو سے فیصلہ چاہتے ہیں۔ اب نکاح باقی ہے اور ایسے شخص کو دینا جائز ہے؟

فتویٰ:

صورت مسؤلہ میں اگر شرعی طریقے سے ایجاب و قبول کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں نکاح کیا گیا ہے تو نکاح صحیح اور نافذ ہے، جب تک خاوند طلاق نہ دے، دوسری جگہ نکاح جائز نہیں۔ واللہ اعلم [۳۰]

زیر نظر استفتا میں کئی امور وضاحت طلب ہیں:

۳۰- مفتی محمود، **فتاویٰ**، ۴: ۶۷۴ (فتویٰ مفتی محمد انور شاہ)۔

(۱) ادلہ بدلہ کا نکاح جس کو شرعی اصطلاح میں شغار کہا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے کہ زیرِ نظر صورت میں ایک لڑکی کا نکاح دوسری لڑکی کے بدلے میں کیا گیا۔ حنفی فقہ ایسے نکاح کو نافذ قرار دیتے ہوئے فریقین کو مہر مثل کا پابند بناتی ہے، جب کہ جمہور فقہا کی نظر میں ایسا نکاح فاسد ہے۔ [۳۱]

سوال یہ ہے کہ کیا زیرِ نظر صورت میں مذکورہ فقہی اختلاف رائے کا اطلاق ہوتا ہے؟ کیوں کہ فریقین کی باہمی رضامندی (کنواری عورت کی سکوتی رضامندی سمیت) جس صورت میں موجود تھی، اب وہ نہیں رہی کہ ایک منکوحہ کی وفات کے بعد دوسری عورت کے نکاح کی رضامندی قائم نہیں رہی جس کا متعلقہ فریق نے برملا اظہار کر دیا ہے لہٰذا ایسی صورت میں حنفی فقہ کے جواز کے موقف کا اطلاق کہاں تک درست ہوگا؟ کیوں کہ مفتی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ عرف ورواج کو بھی پیشِ نظر رکھے۔

علامہ ابن عابدین الشامی، جن کے فتاویٰ پر برصغیر کے حنفی فتاویٰ پر بہت زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ الفاظ و معاملات ہر علاقے میں وہاں کے عرف کے مطابق نافذ ہوں گے اور ان سے وہی بات مراد لی جائے گی جو لوگوں کے درمیان متعارف ہے اور وہی صحت و فساد اور جواز وعدم جواز مراد لیا جائے گا جو وہاں کے لوگوں کے عرف کا تقاضا ہے، اگرچہ فقہا نے صراحت کی ہو کہ الفاظ و معاملات کا تقاضا، لوگوں کے عرف کے برعکس ہے کیوں کہ بات کرنے والا اپنے عرف و عادات کے مطابق ہی انھیں استعمال کرتا ہے اور یہی اس کی گفتگو سے مقصود ہوتا ہے اور وہ ان معانی کا خیال نہیں رکھتا جو فقہا کے پیشِ نظر ہوتے ہیں اور ہر شخص سے معاملہ اس مراد کے مطابق ہی ہوتا ہے اور تمام عرفی الفاظ کے اپنے اصطلاحی مفاہیم ہوتے ہیں جن کے سبب حقیقی معنی، مجاز لغوی کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ [۳۲]

(۲) نکاح کے لیے ایجاب و قبول لڑکی کے والدین نے کیا جب کہ لڑکی بالغ ہے کہ عمر اٹھارہ سال تھی، آیا اس سے اجازت لی گئی یا نہیں؟ حالاں کہ فقہ حنفی کی رو سے بالغ عورت کا نکاح اس کی اپنی اجازت کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ [۳۳]

۳۱- المرغینانی: مصدرِ سابق، ۲: ۳۲۷۔

۳۲- الشامی، **شرح عقود**، ۱۲۱۔

۳۳- المرغینانی: **الهداية**، ۲: ۳۱۴۔

(۳) کیا لڑکا اپنے اخلاقی عیوب کے سبب لڑکی کا کفو (ہم پلہ) ہے یا نہیں؟ کیوں کہ حنفی فقہ نے زوجین کے درمیان جن امور کفاءت کو معتبر قرار دیا ہے، ان میں دیانت یعنی دیانت داری شامل ہے گو امام محمد بن حسن اس کو امور آخرت میں شمار کرتے ہوئے احکام دنیا کے لیے معتبر خیال نہیں کرتے لیکن ان کا بھی کہنا ہے کہ اگر مرد اپنی معاشرتی ساکھ کھو بیٹھا ہے تو ایسی صورت میں وہ نیک عورت کا کفو نہیں رہتا۔[۳۴] اور غیر کفو میں نکاح قابل فسخ شمار ہوتا ہے۔[۳۵]

فتوے میں نہ صرف ان امور سے کوئی اعتنا نہیں کیا گیا، بلکہ مبہم انداز سے جواب تحریر کر دیا گیا، جس سے فتوے کا منشا پورا ہوتا نظر نہیں آتا، کیوں کہ مستفتی کو اگر شرعی طریقے کا علم ہوتا جس کی نشان دہی فتوے میں کی گئی ہے تو اسے استفتا کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

۴- تنسیخ نکاح

اسلامی شریعت میں جس طرح مرد کی طرف سے طلاق کا اختیار استعمال کرنے سے عقد نکاح اختتام پذیر ہو جاتا ہے، اسی طرح کچھ صورتوں میں عدالتی اختیار سے بھی یہ عقد تحلیل ہو جاتا ہے، اس کے اسباب میں فقہا کی مختلف آرا ہیں۔ فقہ حنفی کے روایتی موقف میں عدالتی اختیار بہت محدود ہے مگر برصغیر کے نوآبادیاتی دور میں درپیش حالات کے تناظر میں یہاں کے حنفی اہل علم نے مالکی موقف کو موزوں قرار دیا اور یہی فقیہ کی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ حالات زمانہ کی تبدیلی پر نظر رکھے، کیوں کہ بہت سے ایسے احکام جو صاحب مسلک مجتہد نے اپنے ماحول اور زمانہ کے حالات کے حوالے سے بیان کیے ہوتے ہیں، عرف کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔ چناں چہ اس حوالے سے عائلی مسائل میں مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۹۴۳ء) کی **الحیلة الناجزة للحلیلة العاجزة** ایک نمائندہ حیثیت رکھتی ہے۔ ذیل میں تنسیخ نکاح کے حوالے سے استفتا کے تناظر میں ایک فتوے کا جائزہ پیش ہے۔

استفتا:

کیا فرماتے ہیں علماے دین دریں مسئلہ کہ مسماۃ اسلم خاتون نے اپنے خاوند محمد دین کے خلاف ظلم، تشدد، مارپیٹ، نان ونفقہ نہ دینے اور اس کے زیورات و پارچہ جات چھین لینے کی بنا پر عدالت میں تنسیخ نکاح کا مقدمہ دائر

۳۴- نفس مصدر، ۲: ۳۲۰۔

۳۵- وہبۃ الزحیلی: **الفقه الإسلامي**، ۷: ۸۸۔

کیا۔ عدالت نے پوری تحقیق اور شہادتوں کے اور مندرجہ بالا وجوہات کے ثبوت کے بعد تنسیخ نکاح کا فیصلہ کر دیا جس کا مکمل ثبوت موجود ہے۔ کیا اس صورت میں تنسیخ نکاح شرعاً درست ہے یا نہیں؟

فتویٰ:

بر تقدیر صحت واقعہ یہ تنسیخ شرعاً درست نہیں ہے اور یہ عورت اپنے خاوند سے طلاق حاصل کیے بغیر دوسری جگہ عقد کرنے میں شرعاً مجاز نہیں۔ فقط واللہ اعلم [۳۶]

استفتا کے بیان کے مطابق شوہر بیوی پر جسمانی تشدد، نان ونفقہ نہ دینے اور بیوی کے زیورات و پارچہ جات چھیننے کا مرتکب ہوا، اور یہ تمام امور عدالت کے سامنے مکمل ثبوت کے ساتھ پیش کیے گئے جس پر عدالت نے تنسیخ نکاح کا فیصلہ صادر کر دیا مگر فتوے میں اس کو شرعی طور پر درست قرار نہیں دیا گیا حالاں کہ استفتا میں اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ "عدالت نے پوری تحقیق اور شہادتوں کے اور مندرجہ بالا وجوہات کے ثبوت کے بعد تنسیخ نکاح کا فیصلہ کر دیا جس کا مکمل ثبوت موجود ہے"۔ فتوے میں اس امر کو مسترد کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی حالاں کہ حنفی فقہ، قضائے قاضی کے نہ صرف ظاہری طور پر نفاذ کی قائل ہے، بلکہ وہ اس کو حقیقی معنوں میں نافذ کرنے کی بھی داعی ہے اور یہ قضا کا نفاذ عقود اور فسوخ دونوں میں معتبر ہوتا ہے۔[۳۷]

چناں چہ شیخ الہند مولانا محمود حسن (م ۱۹۱۹ء) کہتے ہیں کہ حکم قاضی، وقوع طلاق میں بلاشبہ نافذ ہو جائے گا کیوں کہ کیونکہ منکوحہ محلِ انشاءِ طلاق ہے اور طلاق منجملہ فسوخ بھی ہے۔[۳۸] حتیٰ کہ اگر قاضی نے جھوٹی شہادتوں کو اپنی دانست میں سچا سمجھ کر فیصلہ کر دیا تو بھی عدالتی فیصلہ نافذ ہو جائے گا؛ کیوں کہ اس کے پاس حقائق تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے اگرچہ جھوٹے دعوے دار اور جھوٹے گواہوں پر گناہ کبیرہ کا وبال ہو گا، جب کہ زیر نظر استفتا میں بیان کردہ صورت حال کے مطابق شوہر "متعنت" ہے، اور ایسی صورت میں عدالت کی طرف تنسیخ نکاح کے اختیار کو عصر حاضر کے حنفی فتاویٰ میں بھی درست قرار دیا گیا ہے کہ متعنت اصطلاح شرع میں اس کو کہتے ہیں جو ضدی اور ظالم ہو جو کہ نہ عورت کو آباد کرے اور نہ طلاق دے، چناں چہ زیر نظر مجموعہ فتاویٰ میں ہی ایک اور مقام پر اس امر کا واضح طور پر ذکر ہے کہ ایسے شخص کی بیوی کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ مسلم عدالت میں

۳۶۔ مفتی محمود، **فتاویٰ**، ۴: ۶۷۳ (فتویٰ مفتی محمد اسحاق)۔

۳۷۔ المرغینانی: مصدرِ سابق، ۳: ۱۴۲؛ ۲: ۳۱۴۔

۳۸۔ محمود حسن، **ایضاح الأدلہ** (کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، (س۔ن))، ۲۱۸۔

دعویٰ کر کے اپنے خاوند کا متعنت (ظالم) ہونا ثابت کرے، عدالت اس امر کی تحقیق کرے اور اس کے خاوند کو بلائے اور اسے مجبور کرے کہ یا تو صحیح طریقہ سے آباد کرے (اور اس سے ضمانت بھی لی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو صحیح طریقہ سے آباد کرے گا) یا طلاق دے دے اور اگر نہ تو آباد کرے اور نہ طلاق دے بلکہ اپنی ضد پر قائم رہے تو حاکم اس کے نکاح کو فسخ کر دے اور یہ حکم، طلاق کے حکم میں ہو گا، بعدہٗ وہ عورت عدت گزار کر دوسری جگہ نکاح کرے۔ [۳۹]

خلاصۂ کلام

زیر نظر فتاویٰ اور ان کے استفتاءات کے پس منظر کے جائزے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں کہ:

۱۔ مفتی کے لیے اپنی مطلوبہ علمی صلاحیت کے ساتھ ساتھ استفتا کے تمام مندرجات کو ملحوظ رکھنا، ان کو درست تناظر میں جاننا اور ان کا صحیح ادراک کرنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بغیر اس کا فتویٰ کتابی معلومات اور شخصی دانست پر تو مبنی ہو سکتا ہے مگر مستفتی کے لیے اس کا متعلقہ ہونا سوالیہ نشان ہوتا ہے۔

۲۔ استفتا کے عمیق جائزے سے مفتی کو زیر نظر مسئلے کے گرد و پیش اور عرف و ماحول سے واقفیت کے علاوہ، انسانی نفسیات اور در پیش سماجی مشکلات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو اس کی بنیادی قابلیت کا تقاضا بھی ہے، اس سے بے اعتنائی کی صورت میں مفتی اپنے فتوے میں متعلقہ سمت میں مناسب رہ نمائی نہیں کر پاتا۔ نیز اس ضمن میں خاص طور پر اسلام کے اصولِ یُسر و سماحت کے حوالے سے مفتی کی رہ نمائی زیادہ قابل عمل اور لائق توجہ بن سکتی ہے۔

۳۔ استفتا کو مطلوبہ اہمیت دینے سے مفتی، مستفتی کی ذہنی استعداد، اور اس کے علم و فہم کی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے مبہم انداز بیان سے بھی احتراز کرے گا، بہ صورت دیگر مستفتی، فتوے کی رہ نمائی سے درست خطوط پر استفادہ نہیں کر سکتا۔

۴۔ اگر مفتی، استفتا کے الفاظ کے عرفی مقاصد سے صرف نظر کرتا ہے تو وہ درست تناظر میں در پیش صورت حال کا جائزہ نہیں لے سکے گا اور اس کی شرعی رہ نمائی بر محل تصور نہ ہو گی۔

۳۹۔ مفتی محمود، مصدرِ سابق، ۷: ۳۹۔

۵- محض فقہی جزئیات پر مبنی افتا کی کارروائی سے فتوے کے مقاصد پورے نہیں ہوتے کیوں کہ مذکورہ جزئیات اپنا مخصوص پس منظر رکھتی ہیں اور ان پر جامد انحصار سے شریعت کے معتبر مقاصد متاثر ہو سکتے ہیں۔

٦- مفتی کے لیے عصری قانون سازی کو یک سر نظر انداز کر کے رائے دینا بھی محل نظر ہے، کیوں کہ اجتہادی مسائل میں قانون سازی، شرعی طور پر مؤثر تصور ہوتی ہے اور اپنی تنفیذی اہمیت رکھتی ہے، کہ اجتہادی امور میں قاضی کے فیصلے کی مؤثر حیثیت تسلیم شدہ رہی ہے۔

❁❁❁❁❁❁